قراآتِ متواترہ اور قراآتِ شاذّہ کا تعارفی مطالعہ اور ان کی قبولیت کی شرائط کا علمی و تحقیقی جائزہ

An introductory study of Qira'at-e-Mutawatira & Qira'at-e-Shadha andthe academic and research based review of the conditions of their acceptance

عبد الرحمن*

ڈاکٹر حافظ محمد ثانی**

ABSTRACT:

The Holy Quran is Allah's words and it is a foundational source of Shariah. It consists of many characteristics. One of them is that it has been revealed with more than one Qira'ah. However, Muslim scholars have a consensus that Allah has permitted to recite in different dialect for the ease of Ummah provided that it is approved by the Holy Prophet. There is no need of Ijtehad in the relevant subject. Qira'ah has a significant position in the science of Sharia. Therefore, like other disciplines to understand the meaning of the Holy Quran, the science of Qira'ah elaborates the brief verses of the Holy Quran even Qira'ah helps derive the Shariah commandments. The science of Qira'ah has assisted different Shariah disciplines whether it is Sarf and Nahw *(*Syntax and morphology) or lexicon. Nonetheless it has a significant value in the Shariah, people are ignorant of the science of Qira'ah and deny varied Qira'ah. Hence, looking at the situation, it is necessary to introduce Qira'ah and shed light on the criteria set by renowned and authenticated scholars to accept the Qira'ah. In this paper, the literal meaning, terminology of Qir'ah, kinds of Qira'ah and the criteria for the acceptance of Qira'ah have been described.

Keywords: Qira'at-e-Mutawatira, Qira'at-e-Shadha, Usmani script, analogy, chain of narration, revelation, grammar's syntax.

قرآن مجید رشد وہدایت کا سرچشمہ، نسخۂ کیمیا، کتابِ مبین اور اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ شریعتِ اسلامیہ میں دین کا بنیادی مآخذ اور اصل الأصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی بہت سی خصوصیات ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ پر ایک سے زائد قراآت کے ساتھ نازل ہوا ہے اور ان قراآت کے ساتھ امت میں مروی ہے چنانچہ امتِ اسلامیہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ عزوجل نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ کی آسانی کی غرض سے انہیں کئی لغات پر قرآن مجید پڑھنے کی اجازت دی لیکن شرط یہ تھی کہ وہ محض آپ ﷺ سے سن لینے کی بنا پر ہو کیونکہ قراآت میں رائے اور اجتہاد کو کوئی دخل نہیں۔ شریعت اور علومِ شریعت میں قراآت کو نہایت اہم مقام حاصل ہے چنانچہ الفاظِ قرآنیہ کے مفاہیم کو سمجھنے کے لیے جہاں دیگر علوم معاون ثابت ہوتے ہیں، وہیں علم القراآت بھی مجمل الفاظ کی تفصیل اور توضیح کرتا نظر

*Research Scholar, Federal Urdu University, Abdul Haq Campus, Karachi.
Email: rana_abdulrahman@hotmail.com

**Associate Professor/Chairman, Federal Urdu University, Abdul Haq Campus, Karachi.

آتا ہے نیز بسا اوقات مختلف قراآت مختلف مسائل کے استنباط کا فائدہ دیتی ہیں۔ علومِ شرعیہ میں سے کوئی ایسا علم نہیں کہ جس میں قراآت سے استفادہ اور معاونت حاصل نہ کی گئی ہو، برابر ہے یہ علم صرف ونحو اور بلاغت کا ہو یا کتبِ لغت وغیرہ ہوں، ان تمام میں قراآت بنیادی رکن اور اساسی حیثیت کی حامل ہیں۔ قراآت کی اس قدر اہمیت اور تواتر کے ساتھ ثابت ہونے کے باوجود ان کی تعریف، احکام، اقسام اور شرائطِ قبولیت کے بارے میں ناواقفیت پائی جاتی ہے حتی کہ قراآتِ متواترہ اور قراآتِ شاذہ کے درمیان فرق نہیں کیا جاتا، چنانچہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اس علم کا تعارف بیان کیا جائے اور قراآت کو قبول کرنے کے ان معیارات پر روشنی ڈالی جائے جو اہلِ ادا نے انتہائی تحقیق و تدقیق کے بعد مقرر کیے ہیں۔ زیرِ نظر تحقیقی مضمون بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی اور کاوش ہے جس میں قراآت کی لغوی و اصطلاحی تعریف، اقسام اور قراآت کو قبول کرنے کی شرائط اور معیارات پر تفصیل کے ساتھ تحقیقی مواد جمع کیا گیا ہے اور ان کا حاصل بھی بیان کیا گیا ہے۔

قراآت کی لغوی تعریف:

لفظِ "قراآت" "قراءۃ" کی جمع ہے، "قراءۃ" کا مادۂ اشتقاق "قَرَءَ" مہموز اللام ہے، یا "قَرَی" معتل الیاء ہے، "قراءۃ" چاہے مہموز سے ہو یا معتل سے، دونوں صورتوں میں اسکا معنی جمع کرنا اور جمع ہونا ہی آتا ہے، چنانچہ علّامہ ابنِ فارسؒ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: قری بالقاف والرّاء والحرف المعتل أصل صحيح يدلّ على جمعٍ واجتماع، من ذلك: القرية، سمّيت قريةً لاجتماع النّاس فيها، ويقولون: قريت الماء في المقراة أي جمعته۔ إذا هُمِز هذا الباب كان هو والأوّل سواءً۔[1]

علّامہ ابو عبیدہؒ نے بھی مذکورہ معنی کے لحاظ سے قرآن کی وجہ تسمیہ یہی بیان کی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

سمّي القرآن، لأنّه يجمع السّور فيضمّها۔[2] یعنی قرآن کو قرآن اس لیے کہتے ہیں کہ یہ سورتوں کا جامع اور ان کو ملانے والا ہے۔ علامہ ابن القیم جوزیؒ "قری یقری" اور "قرأ یقرأ" میں فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اول الذکر معتل الیاء کے باب سے ہے اور اس کا معنی جمع اور اجتماع (جمع کرنا اور جمع ہونا) آتا ہے لیکن "قرأ یقرأ" مہموز اللام سے ہے، جس کا معنی کسی مقررہ حدود و مقدار میں کسی چیز کو ظاہر کرنا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں: ومنه قراءة القرآن لان قارئه يظهره و يخرجه مقدارا محدودا ، لا يزيد ولا ينقص، و يدل عليه قوله ان علينا جمعه و قرآنه (القيامة: 17) ففرق بين الجمع والقرآن ولو كان واحدا لكان تكريرا محضا۔[3] یعنی اس سے دوسرا معنی قراءۃ القرآن مشتق ہے کہ پڑھنے والا اس کو ظاہر کر کے پڑھتا ہے اور مقدار محدود میں بغیر کمی و بیشی کے ادا کرتا ہے، اس پر باری تعالیٰ کا قول (ان علينا جمعه و قرآنه) بھی دلالت کرتا ہے، اس طرح جمع اور قرآن کے درمیان فرق واضح ہو جاتا ہے اور اگر یہ دونوں ہم معنی ہوں (جیسا کہ علامہ ابو عبیدہؒ نے بیان کیا کہ قرآن کا معنی جمع کرنا ہے) تو تکرار محض لازم آتا ہے۔

علامہ راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں: والقراءة ضمّ الحروف والكلمات بعضها إلى بعض في التّرتيل، وليس يُقال ذلك لكلّ جمعٍ، لا يُقال: قرأت القوم إذا جمعتهم، ويدلّ على ذلك أنّه لا يقال للحرف الواحد إذا تفوه به قراءةً[4]۔ یعنی قراءت کا معنی حروف وکلمات کو ترتیل میں جمع کرنے اور ملا دینے کے ہیں، لیکن ہر جمع پر قراءت کا اطلاق نہیں ہو گا، لہٰذا "اَجمعت القوم" کا مفہوم حاصل کرنے کیلئے "قرأت القوم" نہیں کہا جائیگا، اور اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ایک حرف بولنے کو قراءت نہیں کہا جاتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ حروف و کلمات کو ترتیل میں جمع کر دینے کا حاصل بھی یہی نکلتا ہے کہ جمع و قراءت دونوں کا تعلق قرآن سے ہے، کیونکہ حروف و کلمات کو جمع کرنے کی غرض اس کی قراءت ہے، لہٰذا ان دونوں کا وجود آپس میں ایک دوسرے کو مستلزم ہے۔

خلاصہ تعریفات:

قراءت کے مختلف معانی پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس لفظ میں جمع کرنا یا جمع ہونا اور نکالنا یا ڈالنا دونوں معنی باہم لازم وملزوم ہیں اور دونوں کا مفہوم یکے بعد دیگرے بیک وقت موجود ہے اور وہ اس طرح کہ "قراءۃ القرآن" یا "قراءۃ الکتاب" میں بھی زبان پہلے حروف اور کلمات کو جمع کرتی ہے اور پھر ترتیب دے کر انہیں باہر نکالتی ہے اور یہی مفہوم ماقبل میں علامہ ابن فارسؒ کی عبارت سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن کو قرآن اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ پڑھا جاتا ہے اور کتاب اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ مدون ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کو پوری طرح توجہ دینے کا حق یہ ہے کہ اس کو سینوں میں محفوظ کیا جائے اور لکھ کر کتابوں میں محفوظ کیا جائے۔

قراآت کی اصطلاحی تعریف:

اصطلاحی الفاظ کے اعتبار سے قراءت کی تعریف متعدد کتبِ قراآت میں مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے، تاہم مرکزی مفہوم سب کا ایک ہی نکلتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وحی قرآنی کے الفاظ کی ادائیگی میں سماعی اور منقولی اختلاف قراءت کہلاتا ہے اور جس علم میں ادائیگی الفاظ کے اس اختلاف کی کیفیات معلوم کی جاتی ہیں اس کو علم القراءت کہا جاتا ہے۔ اولین دور کی کتب قراءت کی خالص علمی اور مستقل اصطلاحی تعریف سے معدوم ہیں، اگرچہ یہ زمانہ علم قراءت پر کثرت سے تصانیف کا تھا، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ قراءت کی شہرت کی وجہ سے اس کی تعریف نہ کی گئی ہو۔ متاخرین علمائے قراآت کی بیان کردہ تعریفات، زمانی تسلسل کے لحاظ سے پیشِ خدمت ہیں:

علّامہ ابوحیان اندلسیؒ وہ پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے قراآت کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے:

يبحث فيه عن كيفية النطق بالفاظ القرآن. هذا هو القرآن.[5]

ترجمہ: قراآت وہ علم ہے جس میں الفاظِ قرآن کی کیفیتِ ادا سے بحث کی جاتی ہے۔

علامہ ابوحیانؒ کی یہ تعریف قراآت سے زیادہ تجوید کی تعریف معلوم ہوتی ہے کیونکہ تجوید کی تعریف بھی یہی ہے کہ قرآن کے ہر حرف کو اس کی تمام صفات کے ساتھ اس کے مخرج سے ادا کیا جائے چنانچہ تجوید کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: اخراج كل حرف من مخرجه مع اعطائه حقه ومستحقه[6] یعنی ہر حرف کو اس کے مخرج سے نکالنا اور اس کی صفات لازمہ اور صفات عارضہ کو ادا کرنا۔

علّامہ زرکشیؒ نے قراآت کی تعریف اپنی کتاب "البرھان فی علوم القرآن" میں یوں بیان کی ہے:

اختلاف ألفاظ الوحي المذكور في كتبة الحروف أو كيفيتها من تخفيف و تثقيل وغيرها۔[(7)]

ترجمہ: وحی قرآنی کے الفاظ اور اس کی کیفیت مثلاً کلمہ کی تخفیف یا تشدید سے پڑھے جانے میں اختلاف کا نام قراآت ہے۔

علامہ زرکشی نے اس تعریف میں "اختلاف الفاظ القرآن" کے بجائے "اختلاف الفاظ الوحی" کے الفاظ استعمال کیے ہیں، جس سے اس بات کیطرف اشارہ ہوتا ہے کہ یہاں قراآت سے قراآتِ متواترہ اور قراآتِ شاذہ دونوں مراد ہیں، اگر صرف "اختلاف الفاظ القرآن"

کہتے تو اس سے قراءتِ متواترہ تو مراد ہو سکتی تھی مگر شاذہ نہیں، کیونکہ لفظِ قرآن صرف قراآتِ متواترہ کو شامل ہے، جبکہ لفظِ وحی دونوں کو شامل ہے۔ علّامہ ابن الجزریؒ اپنی کتاب "منجد القرئین" میں قراآت کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

القراءات علم بكيفية أداء كلمات القرآن واختلافها بعزو الناقلة۔[8]

ترجمہ: جس علم میں قرآنی کلمات کی کیفیاتِ ادا اور اس میں ناقل یعنی آپ ﷺ سے منقول اختلاف معلوم کیا جاتا ہو، اسکو قراآت کہتے ہیں۔

علّامہ جلال الدین سیوطیؒ نے "الإتقان فی علوم القرآن" میں قراآت کی تعریف ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

فالخلاف إن كان لأحد الأئمّة السبعة أو العشرة أو نحوهم، واتفقت الروايات والطرق عنه فهو قراءة۔[9]

ترجمہ: اگر سات یا دس یا ان کے مثل اماموں میں سے کسی ایک نے اختلاف کیا ہو اور ان سے وہ اختلاف بالاتفاق تمام روایتوں اور طریقوں کے ثابت ہو، تو اسکو قراءت کہتے ہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے قراآت کی اصطلاحی تعریف کی بجائے روایت، وجہ اور طریق کی تعریف کو مد نظر رکھا ہے۔ علامہ شہاب الدین قسطلانیؒ علم القراآت کی تعریف میں اختلافی کلمات کی نوعیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

علم یعرف منه اتفاق الناقلین لکتاب الله و اختلافهم فی اللغة والاعراب والحذف والاثبات والتحریك والاسكان والفصل والاتصال وغیر ذلك من هیئته النطق والابدال من حیث السماء۔[10]

ترجمہ: علم قراآت وہ علم ہے جس میں کتاب اللہ کے نقل کرنے والوں کے سماع پر مبنی وہ اتفاق و اختلاف جانا جاتا ہے جو کہ لغت و اعراب، حذف و اثبات، حرکت و سکون، فصل و اتصال میں نطق و ابدال کی ہیئت و کیفیت کی قبیل سے ہو۔

علامہ طاش کبری زادہؒ نے قراآت کی تعریف میں صراحۃً قراءتِ شاذہ کو بشرطِ شہرت قراآت میں شامل کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

هو علم یبحث فیه عن صورة نظم کلام الله تعالیٰ من حیث وجوه الاختلافات المتواترة و مبادئه مقدمات تواترية ۔۔۔۔۔ وقد یبحث فیه ایضاً عن صورة نظم الکلام من حیث الاختلاف الغیر المتواترة الواصلة الی حد الشهرة و مبادئه مقدمات مشهورة او مرویة عن الاحاد الموثوق بها[11]۔ یعنی علمِ قراآت ایسا علم ہے جس میں قراآتِ متواترہ کے اختلاف کی صورتوں اور اسکے تواتر کی مبادیات و مقدمات کے اعتبار سے کلامِ الٰہی کے نظم کی مختلف صورتوں کے متعلق بحث کی جاتی ہے، نیز اس میں غیر متواتر قراآت جن کو قبولِ عام حاصل ہے، کے اختلاف کی وجوہ اور اس کی شہرت کے مبادیات اور مقدمات سے بحث کی جاتی ہے، یا اس میں ان قراآت آحاد و شاذہ سے بحث کی جاتی ہے جو معتبر اور قابلِ اعتبار ہیں۔

علامہ البناء الدمیاطیؒ نے علامہ قسطلانیؒ کی ذکر کردہ تعریف کو معمولی تبدیلی کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:

علم یعلم منه اتفاق الناقلین لکتاب الله تعالیٰ واختلافاتهم فی الحذف والاثبات والتحریك والتسكین والفصل و الوصل وغیر ذلك من هیئته النطق والابدال من حیث السماء۔[12]

دورِ جدید کے مشہور ماہرِ قراآت علامہ ابو الفتاح القاضیؒ اپنی کتاب ''البدور الزاہرۃ'' میں قراآت کا تعارف کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ: هو علم يعرف به كيفية النطق بالكلمات القرآنية و طريق ادائها اتفاقاً و اختلافاً مع عزو كل وجه لناقله۔[13] یعنی علمِ قراآت وہ علم ہے جس میں قرآنی کلمات کی ادائیگی کی کیفیت اور ان کے ادا کرنے کے اتفاقی واختلافی طرق کو نبی کریم ﷺ سے منقول ہونے کی بنا پر معلوم کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر عبد الہادی الفضلی اپنی کتاب ''تاریخ القراءات القرآنیۃ'' میں قراآت کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

ان القراءة هي النطق بالفاظ القرآن كما نطقها النبي صلى الله عليه وسلم[14]۔ یعنی علم قراآت وہ علم ہے جس سے قرآنی الفاظ کی وہ ادائیگی معلوم ہوتی ہے جس طرح کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادائیگی کی۔

خلاصہ تعریفات:

ان تمام تعریفات کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ وحی قرآنی کے الفاظ کی ادائیگی میں سماعی اور منقولی اختلاف قراآت کہلاتا ہے اور جس علم میں ادائیگی الفاظ کے اس اختلاف کی کیفیات معلوم کی جاتی ہیں اس کو علم القراآت کہا جاتا ہے۔ اس میں ذاتی رائے یا قیاس کا کوئی دخل نہیں۔ ذکر کردہ ان سب تعریفات سے درج ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں:

قراآت کا تعلق وحی قرآنی سے ہے۔ قراآت نقل اور سماع پر موقوف ہے۔ ان میں رائے یا قیاس کو کوئی دخل نہیں۔

قراآت کی اقسام:

ہر دور میں ایک بڑی جماعت ایسی رہی ہے کہ جس کا مشغلہ قرآن اور اس کی قراآت کا تعلّم و تعلیم تھا، ان میں سے بعض ضبط، عدالت، اتقان اور روایت و درایت میں کامل اور حجت تھے اور بعض میں کسی وصف کے اعتبار سے کمی تھی جس کی وجہ سے اختلاف رونما ہونے لگا اور قریب تھا کہ حق و باطل میں التباس ہو جائے۔ اس وقت محقق علمائے امت اور حاذق مجتہدین کتاب اللہ کی خدمت کے لیے کھڑے ہوئے اور انہوں نے روایات اور طرق کو جانچا اور حروف کی پڑتال کی، پھر قراآت کے لیے اصول و ارکان مقرر فرمائے جن کی روشنی میں متواتر کو احاد سے، مشہور کو شاذ سے اور صحیح کو فاسد سے ممتاز کیا، اس طرح قراآت کی مختلف اقسام وجود میں آئیں۔ عرفِ عام میں عموماً قراآت کی دو مشہور قسمیں ذکر کی جاتی ہیں: (1) قراآتِ متواترہ (2) قراآتِ شاذہ

قراآت متواترہ سے مراد وہ صحیح اور مقبول قراآت مراد لی جاتی ہیں جو نبی کریم ﷺ سے بطریقِ تواتر مروی ہوں اور عربی قواعد و رسم عثمانی کے موافق ہوں۔ ان کا حکم یہ ہے کہ ان کا پڑھنا صحیح ہے اور ان کی قرآنیت کا اعتقاد کرنا ضروری اور لازمی ہے اور انکار یا استہزاء گناہ اور کفر ہے۔

قراآتِ شاذہ سے مراد ضعیف سند والی قراآت ہیں یا پھر وہ قراآت جو عربی قواعد اور رسم عثمانی کے موافق نہ ہوں۔ ان کا حکم یہ ہے کہ یہ نہ قرآن ہیں اور نہ ہی نماز میں ان کی تلاوت جائز ہے، خواہ فرض نماز ہو نفل نماز۔ نیز قراآتِ شاذہ کی تلاوت پر اصرار کرنے والا سزا کا مستحق ہے، تاہم نماز کے علاوہ ان قراآت کو تعلیم و تعلّم کی غرض سے بیان کرنا یا قرآن کی کسی آیت کے مفہوم کی وضاحت کیلئے پیش کرنا سب

کے نزدیک جائز ہے۔ علمائے قرا آت نے اسکی اقسام تفصیل سے بیان کیا ہے چنانچہ امام سیوطیؒ نے قرا آت کی باعتبار سند چھ قسمیں بیان کی ہیں:

(1) متواترہ: اس کا مطلب ہے کہ ایک قراءت اتنے راویوں سے منقول ہو کہ عقلاً اتنی بڑی تعداد کا جھوٹ پر اتفاق ناممکن ہو، اس کی مثال وہ تمام قرا آت ہیں جن کے نقل پر طرق متفق ہیں۔

(2) مشہورہ: اس کا مطلب یہ ہے کہ روایت کرنے والا عادل اور ضابط ہو، قراءت عربیت کے موافق ہو، مصاحف میں سے کسی مصحف کے موافق ہو چاہے وہ ائمہ سبعہ سے یا ائمہ عشرہ سے منقول ہو۔

ان دونوں قسموں پر اعتقاد رکھنا اور ان کے مطابق قراءت کرنا فرض ہے۔

(3) آحاد: اس سے مراد وہ قراءت ہے جو صحیح سند سے ثابت ہو مگر رسمِ عثمانی یا عربیت کے خلاف ہو، یا وہ حدِ شہرت کو نہ پہنچی ہو۔ اس کا حکم یہ ہے کہ نہ تو اس پر اعتقاد رکھنا واجب ہے اور نہ اس کے مطابق قراءت کرنا جائز ہے۔

(4) شاذ: اس سے مراد وہ قراءت ہے جو صحیح سند سے ثابت نہ ہو۔

(5) موضوع: اس سے مراد وہ قراءت ہے جو بغیر کسی اصل کے کسی کی طرف منسوب کر دی گئی ہو۔

(6) مدرج: اس سے مراد یہ ہے کہ کلمات قرآنیہ کے درمیان تفسیر کی غرض سے کسی کلمہ کا اضافہ کر دینا۔[15]

علامہ ابن جنیؒ نے اپنی کتاب "المحتسب" میں قرا آت کی درج ذیل دو قسمیں بیان کی ہیں:

(1) قراءتِ متواترہ: اس سے مراد وہ قراءت ہے جس پر اکثر قراء کا اتفاق ہے جس کو علامہ ابنِ مجاہد نے اپنی کتاب " السبعۃ" میں جمع کیا ہے۔

(2) قراءتِ شاذہ: یہ وہ قراءت ہے جو سبعہ قرا آت سے تجاوز کر گئی ہے۔[16]

علامہ ابن جنیؒ کی مذکورہ تقسیم سے یہ وہم ہوتا ہے کہ قرا آتِ سبعہ کے علاوہ باقی قرا آت شاذ ہیں چاہے وہ قرا آتِ ثلاثہ میں سے ہی کیوں نہ ہوں، جبکہ معاملہ یہ ہے کہ قرا آتِ ثلاثہ بھی قرا آتِ سبعہ کی طرح متواتر ہیں۔

امام مکی بن ابی طالبؒ قرا آت کی اقسام بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ قراءت کی تین قسمیں ہیں:

(1) قراءت کی ایک قسم وہ ہے جو آجکل پڑھی جارہی ہے اور اس میں تین شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ سند کا صحیح ہونا۔ رسمِ عثمانی کی موافقت۔ نحوی وجوہ میں سے کسی وجہ کی موافقت۔ جس قراءت میں یہ تین صفات پائی جائیں اسے قرآن کہا جائے گا اور صحت کے اعتبار سے وہ قطعی ہوگی اور اس کا انکار کرنا کفر ہوگا۔

(2) قراءت کی دوسری قسم وہ ہے جو اخبارِ آحاد سے منقول ہو اور نحوی وجہ کے موافق ہو البتہ رسمِ عثمانی کے موافق نہ ہو، ایسی قراءت مقبول تو ہے لیکن دو اسباب کی وجہ سے پڑھی نہیں جائے گی (1) اخبارِ آحاد سے منقول ہو، حالانکہ قرآن کا ثبوت اخبارِ آحاد سے صحیح نہیں (2) اجماع کے خلاف ہو لہذا یہ قطعی الثبوت بھی نہیں ہوگی اس لیے ایسی قراءت کو نہیں پڑھا جائیگا اور اس کا انکار کرنے والا کافر بھی نہیں ہوگا۔

(3) قراءت کی تیسری قسم وہ ہے جو غیر ثقہ سے منقول ہو یا منقول تو ثقہ سے ہو اور رسمِ عثمانی کی موافقت بھی ہو مگر اس میں وجہِ عربیت نہ ہو، ایسی قراءت کی تلاوت کرنا جائز نہیں اور اس کا انکار کرنے والا کافر بھی نہیں۔[17]

قراآتِ صحیحہ کے ارکان(قراآت کی قبولیت کی شرائط)

ہر منقولی چیز خواہ اس کا تعلق حدیث سے ہو یا قراآت سے ہو یا پھر تاریخی واقعات سے ہو، ان میں سے ہر ایک صحت وضعف اور ردو قبول کا احتمال رکھتا ہے۔جب احادیث کی روایت کثرت سے ہونے لگی اور لوگوں میں ایسی احادیث عام ہونے لگیں جو آپ ﷺ سے منقول نہیں تھیں تو محدثین نے احادیث کو پرکھنے کے لیے ایسے اصول و قواعد بنائے جن سے صحیح اور ضعیف احادیث میں فرق ہو اور آنحضرت ﷺ کی طرف من گھڑت اقوال منسوب نہ ہوں۔اسی طرح کا معاملہ قراآت میں بھی پیش آیا کہ جب قراآت بکثرت پھیلنے لگیں تو بعض لوگوں نے اپنی طرف سے قراآت گھڑنا شروع کر دیں یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے منسوخ قراآت کو بھی قراءتِ قرآن کا حصہ بنالیا، حالانکہ صدرِ اول کے مسلمان اس بات پر اتفاق کر چکے تھے کہ کسی بھی قراءت پر اس وقت تک قرآن مجید کا حکم نہیں لگایا جائے گا جب تک کہ اس کا آنحضرت ﷺ سے منقول ہونا ثابت نہ ہو جائے اور اس قراءت کا صحابہ کرام رضی اللہ عنھم میں مشہور ہونا ثابت نہ ہو جائے،یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام نے مصاحفِ عثمانیہ کی تدوین وترتیب کے وقت ایسی قراآت کو لیا جو معیار کے مطابق تھیں۔مصاحفِ عثمانیہ میں صرف ان قراآت کو کو نقل کیا گیا جن پر لوگ متفق تھے کہ عرضۂ اخیرہ میں آنحضرت ﷺ نے جبرئیلؑ کے سامنے پڑھا اور اس کے مطابق صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ کو پڑھایا، لیکن جب اسلام عرب سے نکل کر عجم تک پھیلا اور عجمیوں نے اسلام قبول کیا اور مختلف محاذوں پر مختلف علاقوں کے لوگ اکھٹے ہوتے اور ایک دوسرے کو قرآن سناتے تو بعض لوگ ان قراآت کا انکار کرتے جو انہوں نے نہیں پڑھی تھیں حالانکہ وہ بھی آپ ﷺ سے صحیح ثابت ہوتی تھیں۔اسی طرح بعض لوگوں نے ان قراآت کو بھی قرآن کا حصہ بنا کر پڑھنا جاری رکھا جو عرضۂ اخیرہ میں منسوخ ہو چکی تھیں تو ایسے موقع پر خدامِ قرآن اور علماء امت نے قراآت کی چھان بین کر کے منسوخ اور من گھڑت قراآت کو صحیح قراآت سے الگ کیا اور قراآت کے ارکان اور ان کی قبولیت کے معیارات مقرر کیے۔ذیل میں قرآن کے ارکان یعنی قراآت کو قبول کرنے کی شرائط کا تحقیقی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ضابطہ قراآت:

کسی بھی قراءت کو قبول کرنے کی ائمہ کرام اور قراءِ عظام نے تین شرطیں بیان کی ہیں:

(1)سند کی صحت یعنی وہ قراءت ایسی ہو کہ اس کی سند نبی کریم ﷺ تک متصل ہو اور متواتر ہو۔(2) عثمانی مصاحف میں سے کسی ایک مصحف کے رسم کے مطابق ہو اگرچہ یہ مطابقت احتمالی یا تقدیری ہی کیوں نہ ہو۔(3) نحوی وجوہ میں سے کسی وجہ کے موافق ہو۔

علامہ ابن الجزریؒ نے اپنی کتاب ''طیبۃ النشر فی القراآت العشر'' میں ان شرائط کو یوں بیان کیا ہے:

فکل ما وافق وجه نحو — وکان للرسم احتمالا یحوی

وصح اسنادا هو القرآن — فهذه الثلاثة الارکان

وحیثما یختل رکن اثبت — شذوذه لو انه فی السبعة[18]

یعنی قراآت کا ہر وہ اختلاف جو کسی نحوی وجہ کے موافق ہو اور رسم عثمانی کی موافقت اس کو حاوی ہو گو وہ رسم کی موافقت احتمال ہی کے طور پر ہو اور وہ اختلافی وجہ سند کی رو سے بھی صحیح ہو تو یہ اختلافی وجہ ان تین شرطوں سے قرآن کا حصہ ہے پس کسی اختلافِ قراءت کو قبول

کرنے کے یہ تین ارکان ہیں اور جس جگہ ان تین ارکان میں سے کوئی رکن خلل پذیر ہو جائے تو وہ شاذ کی قبیل سے ہو گا اگرچہ وہ وجہ قراءِ سبعہ ہی کی قراآت میں سے کیوں نہ ہو۔

تینوں شرائط کی وضاحت:

پہلی شرط: سند کی صحت: اس سے مراد یہ ہے کہ اس قراءت کو نقل کرنے والے تمام راوی اول تا آخر عدالت، ضبط، قوتِ حافظہ اور قلتِ خطا کی صفات سے متصف ہوں نیز وہ قراءت اہلِ فن کے نزدیک مشہور ہو اور وہ اس کو غیر معتبر یا ایسی قراءت شمار نہ کرتے ہوں جس کو صرف بعض ائمہ کرام روایت کرتے ہوں۔ اگر کسی قراءت میں مذکورہ شرط نہ پائی جائے تو اس کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

تواتر کی شرط:

اہلِ فن اس بات پر تو متفق ہیں کہ قراءت کی قبولیت کے لیے سند کا متصل ہونا ضروری ہے لیکن اس بات میں اختلاف ہے کہ تواتر شرط ہے یا نہیں؟ اس میں دو فریق ہیں۔

پہلا فریق:

پہلے فریق میں وہ علماء شامل ہیں جنہوں نے صرف اتصالِ سند کو ضروری قرار دیا ہے، تواتر کی شرط نہیں لگائی۔ اس ضمن میں علامہ ابن جزریؒ، علامہ ابو شامہؒ اور امام مکی بن ابی طالبؒ کے نام سامنے آتے ہیں۔ ذیل میں مذکورہ ائمہ کرام کی عبارات نقل کی جارہی ہیں۔ علامہ ابن جزریؒ شروع میں قبولِ قراءت کے واسطے تواتر کی شرط کے قائل تھے جیسا کہ انہوں نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "منجد المقرئین" میں لکھا ہے کہ:

نقول: کل قراءۃ وافقت العربیۃ مطلقا ووافقت أحد المصاحف العثمانیۃ ولو تقدیرا أو تواتر نقلها هذه القراءۃ المتواترۃ المقطوع بها[19]۔ یعنی ہم کہتے ہیں کہ ہر وہ قراءت جو عربیت کے مطلقا موافق ہو اور مصاحفِ عثمانیہ میں سے کسی ایک مصحف کے مطابق ہو اگرچہ تقدیری طور پر ہی کیوں نہ ہو یا وہ تواتر کے ساتھ منقول ہو تو یہ قراءتِ متواترہ ہے جس پر قطعیت کا حکم لگایا گیا ہے۔

پھر بعد میں ان کا مؤقف بدل گیا جیسا کہ وہ خود اپنی کتاب "النشر فی القراآت العشر" میں فرماتے ہیں: لقد کنت قبل أجنح إلی هذا القول ثم ظهر فساده و موافقۃ ائمۃ السلف والخلف۔[20]۔ یعنی پہلے میں بھی اس قول (تواتر) کا قائل تھا، بعد میں جب اس قول کا فساد ظاہر ہوا تو میں نے اس قول کو چھوڑ کر ائمہ سلف وخلف کی پیروی کر لی۔

اس عبارت سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ ابن جزریؒ کے نزدیک تواتر شرط نہیں، صرف سند کا متصل ہونا کافی ہے۔

علامہ ابو شامہؒ بھی تواتر کو ضروری قرار نہیں دیتے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

وقد شاع علی ألسنۃ جماعۃ من المقرئین المتأخرین وغیرهم من المقلدین أن القراءات السبع کلها متواترۃ أی کل فرد فرد ماروی عن هؤلاء الأئمۃ السبعۃ قالوا والقطع بأنها منزلۃ من عند الله واجب ونحن بهذا نقول ولکن فیما اجتمعت علی نقله عنهم الطرق واتفقت علیه الفرق من غیر نکیر له مع أنه شاع واشتهر واستفاض فلا أقل من اشتراط ذلك إذا لم یتفق التواتر فی بعضها[21]۔

ترجمہ: قراءِ متاخرین کی ایک جماعت کے ہاں قراءِ سبعہ کی ہر قراءت متواتر ہے اور اس کے منزل من اللہ ہونے کا قطعی یقین

کرنا ضروری ہے۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں لیکن صرف ان وجوہ کے بارے میں جن کو ان کے قراء سے نقل کرنے پر اتفاق ہو اور ان پر سب جماعتوں کا اتفاق ہو نیز وہ مشہور بھی ہوں اور چونکہ بعض وجہ ایسی بھی ہیں جن میں تواتر نہیں پایا جاتا، لہذا ان کے لیے شہرت شرط ہے۔

امام مکی بن ابی طالبؒ بھی قبولِ قراءت کے واسطے تواتر کو شرط قرار نہیں دیتے چنانچہ وہ فرماتے ہیں: قراءتِ صحیحہ وہ ہے کہ جس کی سند نبی کریم ﷺ تک صحیح ہو، عربیت کی رو سے وہ وجہ جائز ہو اور مصاحف کے رسم کے مطابق ہو۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ ان کے ہاں تواتر شرط ہے جیسا کہ ان کی کتاب "الإبانۃ" کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں: أن ينقل عن الثقات إلى النبی ﷺ ويكون وجهه فی العربية التی نزل بها القرآن شائعا ويكون موافقا لخط المصحف [22]۔ وہ قراءت جو آنحضرت ﷺ تک ثقہ راویوں سے منقول ہو اور وجہِ عربی کے موافق ہو جس پر قرآن کا نزول ہوا ہے اور مصحفِ عثمانی کے رسم کے موافق ہو۔

مذکورہ عبارت میں ثقات کا لفظ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے ہاں تواتر شرط ہے۔ علامہ عبد القیوم سندیؒ نے بھی اپنی شہرہ آفاق کتاب "صفحات فی علوم القراآت" میں اسی بات کو راجح قرار دیا ہے کہ امام مکی بن طالب کے ہاں تواتر شرط ہے۔

دوسرا فریق:

دوسرا فریق ان علماء کا ہے جنہوں نے تواتر کی شرط لگائی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ قراآتِ متواترہ اور قراآتِ شاذہ کے درمیان فرق کرنے کے لیے اصل معیار تواتر ہے لہذا جو قراءت تواتر سے منقول ہو گی اس کے قرآن ہونے کا اعتقاد کیا جائے گا اور جو قراءت تواتر کی صفت سے خالی ہو گی اسے قرآن نہیں سمجھا جائے گا کیونکہ دین کا دار مدار قرآن پر ہے اور اس کے ثبوت کے لیے تواتر کا ہونا نہایت ضروری ہے ورنہ اس قراءت کا شاذ کہا جائے گا اور اس کو قرآن شمار نہیں کیا جائے گا۔ تواتر کو ضروری قرار دینے والے علماء میں علامہ ابن عبد البر، امام ابن عطیہ، امام ابن تیمیہ، علامہ نووی، علامہ زرکشی، علامہ ابن حاجب، امام جعبری، علامہ نویری، امام دانی، امام ابو القاسم الہذلی، امام ابو القاسم الصفراوی، امام ابو الحسن سخاوی اور علامہ سیوطی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے جلیل القدر لوگ شامل ہیں، چنانچہ امام جعبریؒ فرماتے ہیں:

إذا تواترت القراءة علم كونها من الحروف السبعة ولا يتوقف ثبوتها على العربية والرسم [23]۔

ترجمہ: جب قراءت متواتر ہو تو اس کا حروفِ سبعہ میں سے ہونا معلوم ہو گا اور اس کا ثبوت (اس وقت) عربیت اور رسم پر موقوف نہیں ہو گا۔

نیز وہ مزید فرماتے ہیں کہ تمام قراآت کیلئے ضابطہ یہ ہے کہ اس کا نقل تواتر سے ثابت ہو۔ عربیت کے موافق ہو بغیر کسی قید کے، اور مصاحف کے رسم کے مطابق ہو اگرچہ تقدیراً ہو، تو جو ایسا ہو گا وہ احرفِ سبعہ میں سے ہو گا اور جس میں یہ شرائط نہ پائی جائیں وہ شاذ ہے۔ علامہ صفاقسیؒ فرماتے ہیں :مذهب الأصوليين و فقهاء المذاهب الأربعة والمحدثين والقراءة أن التواتر شرط فی صحة القراءة ولا تثبت بالسند الصحيح غير المتواتر، ولو وافقت رسم المصحف العثمانية والعربية۔[24]

ترجمہ: اصولیین، مذاہبِ اربعہ کے فقہاء، محدثین اور قراء کرام اس بات کے قائل ہیں کہ قراءت کی صحت کے لیے تواتر شرط ہے اور وہ قراءت جو متواتر نہ ہو، صحیح سند، مصاحفِ عثمانیہ اور عربیت کے قواعد کی مطابقت کے باوجود صحیح نہیں کہلائے گی۔

علامہ نویریؒ نے ان لوگوں کی سختی سے تردید کی ہے جنہوں نے تواتر کو شرط قرار نہیں دیا چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

یہ کہنا کہ قراءت کے ثبوت کے لیے تواتر ضروری نہیں، یہ قول فقہاء، محدثین اور دیگر علماء کے اجماع کے خلاف ہے کیونکہ مذاہبِ اربعہ کے جمہور علماء کے نزدیک قرآن وہ ہے جو مصحف کے دوگتوں کے درمیان ہے اور تواتر کے طور پر ہم تک پہنچا ہے چنانچہ جس نے بھی قرآن کی تعریف کی ہے اس نے تواتر کو ضروری قرار دیا ہے جیسا کہ علامہ ابن حاجب نے کہا ہے، لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ائمہ اربعہ کے نزدیک قرآن کے لیے متواتر ہونا ضروری ہے اور اس بات کی تصریح علامہ ابن عبد البر، ابن عطیہ، امام نووی، امام زرکشی، امام سبکی رحمہم اللہ اور ان کے علاوہ علماء کی اکثریت نے کی ہے اور اس بات پر قراء کا اتفاق ہے۔[25]

علامہ نویریؒ نے امام ابن جزریؒ کے قول "وصح اسناداً" پر تبصرہ کرتے ہوئے "طیبۃ النشر" کی شرح میں لکھا ہے کہ: علامہ ابن جزریؒ کے قول "وصح اسنادا" سے توبظاہر یہ بات سامنے آتی ہے کہ قرآن کے ثبوت کیلئے پہلی دو شرطوں سمیت صحتِ سند ہی کافی ہے اور تواتر کی ضرورت نہیں، یہ ایک نیا اور جدید قول ہے جو کہ فقہاء اور محدثین کے اجماع کے خلاف ہے، اس قول کی وجہ سے بہت سارے لوگ گمراہ ہو گئے اور ایسی قراآت کی تلاوت کرنے لگے جن کی کوئی اصل ہے ہی نہیں اور یہ کہتے ہیں کہ قراآت کے ثبوت کے لیے تواتر شرط نہیں۔[26]

مذاہب ائمہ اربعہ کے ائمہ کرام میں سے جمہور کا مسلک یہ ہے کہ قرآن نام ہے اس چیز کا جو مصاحف میں نقلِ متواتر کے ساتھ نقل کیا گیا ہو چنانچہ اصولِ فقہ کی کتابوں میں قرآن کی تعریف یوں نقل کی گئی ہے: "القرآن ما بين دفتي المصاحف نقلاً متواتراً" اس تعریف میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے کہ تواتر قرآن کا حصہ ہے، قرآن کا تصور اس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا اور ایسی صورت میں مذاہبِ اربعہ کے ائمہ کرام کے نزدیک بھی تواتر شرط قرار پاتا ہے اور ان میں سے کسی نے بھی اس بات کی مخالفت نہیں کی ہے اور اتنے سارے لوگوں نے اس کی صراحت کی ہے جو حدود و شمار سے باہر ہیں۔ لہذا علامہ ابن جزریؒ وغیرہ کا تواتر کو شرط قرار نہ دینا کوئی مضر نہیں کیونکہ آپ کے علاوہ دیگر حضرات نے تواتر کو شرط قرار دیا ہے بلکہ امت کا اس کے شرط ہونے پر اجماع ہے۔

مختصراً یہ کہ جمہور علماء اور فقہاء کے نزدیک قراءت کی قبولیت کیلئے سند کے ساتھ تواتر کی شرط ضروری ہے، اگر تواتر کی شرط نہ ہو تو اس قراءت کو قبول نہیں کیا جائے گا اگرچہ اس کی سند صحیح کیوں نہ ہو اور اسی طرح مصحفِ عثمانی کی موافقت بھی کیوں نہ ہو۔ یہ شرط اسی لیے لگائی گئی ہے کہ قرآن کو غیر قرآن سے الگ کیا جائے یا منسوخ کو غیر منسوخ سے جدا کیا جاسکے۔ نیز علامہ نویریؒ اور علامہ عبد القیوم سندیؒ نے بھی تواتر کی شرط پر امت کا اجماع نقل کیا ہے۔[27]

دوسری شرط: رسمِ عثمانی کے موافق ہو

اس شرط کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عثمانِ غنی نے جو آٹھ مصاحف لکھوائے تھے وہ قراءت ان میں سے کسی ایک مصحف میں لکھی ہوئی ہو گو سب میں نہ ہو، لہذا اس میں وہ کلمات بھی شامل ہو جائیں گے جو بعض مصاحفِ عثمانیہ میں لکھے ہوئے ہیں مثلاً سورۂ حدید میں "فإن الله هو الغني الحميد" کو علامہ ابن عامر شامیؒ "فإن الله الغني الحميد" پڑھتے ہیں کیونکہ مصحفِ شامی میں اسی طرح لکھا ہوا ہے اور باقی قراء "هو" کے ساتھ پڑھتے ہیں کیونکہ باقی مصاحفِ عثمانیہ میں اسی طرح لکھا ہے۔ اسی طرح سورۂ بقرہ میں "وقالوا اتخذ الله ولداً" کو علامہ

ابن عامر شامی واؤ کے بغیر پڑھتے ہیں کیونکہ مصحفِ شامی میں بغیر واؤ کے لکھا ہے جبکہ باقی قراء "واؤ" کے ساتھ پڑھتے ہیں کیونکہ باقی مصاحف میں واؤ کے ساتھ مرسوم ہے۔اسی طرح اور بھی بہت سے کلمات ہیں جن کے بارے میں مصاحف مختلف ہیں کہ بعض میں تو مرسوم ہیں اور بعض میں نہیں اور تمام مقامات کے ائمہ کرام کی قراآت بھی ان کلمات میں اپنے مصاحف کے مطابق وارد ہوئی ہیں اور اگر یہ کلمات ان مصاحف میں اس طرح مرسوم نہ ہوتے تو یہ سب قراء تیں متفق علیہ رسم کے خلاف ہونے کی بنا پر شاذ ہوتیں۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ رسم کی موافقت بھی دو طرح پر ہے:

1: تحقیقی: اس کا مطلب یہ ہے کہ کلمہ کا رسم اور کتابت صراحتاً اور ظاہراً اس کے تلفظ کے مطابق ہو اور اکثر و بیشتر کلمات اسی طرح ہیں مثلاً سورۂ مائدہ میں "من أنصار" کے کلمہ میں فتح اور امالہ دونوں قراء تیں ہیں اور یہ دونوں قراآت تحقیقاً رسم کے مطابق ہیں کیونکہ مصاحفِ عثمانی میں نقطے اور حرکات نہیں تھیں، اس لیے اکثر کلمات میں ایک ہی رسم سے تمام قراء تیں نکل آتی تھیں۔

2: تقدیری: اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی معقول علت اور حکمت کی بنا پر کلمہ کا رسم اس کے تلفظ کے خلاف ہو پس اس حکمت کی وجہ سے اس رسم کو حکماً موافق ہی سمجھا جاتا ہے اس بنا پر کہ اس کلمہ کی لکھنے کی متعدد جہتیں ہیں مثلاً سورۂ فاتحہ میں "ملك" کا کلمہ تمام مصاحف میں الف کے بغیر لکھا ہوا ہے لیکن بعض قراءتوں میں الف کے ساتھ بروزنِ فاعل "مٰلِكِ" پڑھا جاتا ہے اور باقی قراآت میں الف کے بغیر بر وزنِ فَعِلِ "مَلِكِ" پڑھا جاتا ہے، لہٰذا الف کے حذف والی قراءت تو تحقیقاً اور ظاہراً رسم کے موافق ہے اور الف کے اثبات والی قراءت احتمالاً اور تقدیراً رسم کے موافق ہے کیونکہ یہی کلمہ سورۂ آل عمران میں بھی وارد ہے اور وہاں تمام مصاحف میں الف کے بغیر مرسوم ہے لیکن اس کی قراءت الف کے اثبات کے ساتھ ہے۔

تیسری شرط: نحوی وجہ کی موافقت:

اس شرط کا مطلب یہ ہے وہ قراءت نحوی وجوہ میں سے کسی وجہ کے موافق ہو اگرچہ وہ وجہ ضعیف ہو یعنی ہر وہ قراءت جو متواتر سند کیساتھ منقول ہو اور رسمِ عثمانی کے بھی موافق ہو، اس کیلئے ضروری ہے کہ لغتِ عرب میں بھی اس کی کوئی وجہ بنتی ہو، اگرچہ وہ زیادہ معروف نہ ہو، عام ہے کہ وہ وجہ فصیح ہو یا فصیح تر، متفق علیہ ہو یا مختلف فیہ، کیونکہ جو قراءت مشہور اور شائع ہو اور مصحف عثمانی کے موافق ہو اور اسکی سند صحیح ہو تو لغت یا نحو کے اعتبار سے ضعیف ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا مثلاً امام حمزہؒ کی قراءت "والأرحامِ" میم کے جر کے ساتھ ہے اور باقی قراء کے نزدیک میم کے نصب کے ساتھ ہے، اس پر بعض نحویین کا اعتراض ہے کہ یہ قراءت نحوی قواعد کے خلاف ہے، حالانکہ نحویین کی یہ بات درست نہیں کیونکہ اس قراءت کی توجیہ یوں کی جاسکتی ہے کہ "والأرحامِ" میم کے جر کے ساتھ یا تو "بہ" کی ضمیرِ مجرور پر عطف ہونے کی وجہ سے ہے، یا پھر یہاں حرفِ جر محذوف ہے، یا پھر "والأرحامِ" میں واؤ قسمیہ ہو بہر حال ان تینوں وجوہات کی بنا پر امام حمزہؒ کی قراءت میں کوئی اشکال نہیں ہے اور قراءت جب سندِ صحیح سے ثابت ہو تو نحوی مخالفت سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ قراءت سنتِ متبعہ ہے، اس کا قبول کرنا واجب اور اس پر عمل کرنا لازم ہے۔

علامہ زرقانیؒ اپنی کتاب "مناہل العرفان" میں اس شرط پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

یقیناً علمائے نحو نے اپنی نحوی قواعد کو بنانے اور ترتیب دینے میں کتاب اللہ، احادیث نبوی ﷺ اور کلامِ عرب سے مدد لی ہے، پس جب قرآن کی قرآنیت مقبول روایت کے ذریعے ثابت ہوگی تو علمائے نحو کیلئے بھی حَکَم بن جائے گی اور جو قواعد انہوں نے بنائے ہیں ان پر بھی یہی قرآن حَکَم ہوگا (نہ یہ کہ یہ قواعد قرآن کیلئے حَکَم ہونگے کہ قرآن کو قواعد کے مطابق بنانے کی کوشش کی جائے ورنہ رد کر دیا جائے) تو ضروری ہے کہ علمائے نحو اپنے قواعد کے بارے میں قرآآت کی طرف رجوع کریں اور اپنے قواعد کے لیے قرآآت کو معیار بنائیں۔[28]

علامہ جزریؒ نے امام دانیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: قرآآت کے امام قرآن کے کسی حرف میں اس وجہ پر عمل نہیں کرتے جو لغت میں زیادہ مشہور اور قیاس کے زیادہ موافق ہو، بلکہ اس پر عمل کرتے ہیں جو نقل کے اعتبار سے ثابت تر اور روایت کے لحاظ سے صحیح تر ہو۔ اور جب کوئی حرف اس طرح ثابت ہو جائے تو اس کو نہ عربیت کا قیاس رد کر سکتا ہے اور نہ لغت کی شہرت کیونکہ قراءت سنتِ متبعہ ہے جس کا قبول کرنا واجب اور اس پر اعتماد لازم ہے۔[29]

تحقیق کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ شرط اپنے مفہوم کے اعتبار سے حقیقی حیثیت نہیں رکھتی کیونکہ اس کو دو سبب کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے: ایک یہ کہ اس کا وقوع ممکن نہیں ہے، کیونکہ ایسی کسی قراءت کا وجود نہیں ہے جو متواتر ہو، رسمِ عثمانی کے موافق ہو اور لغتِ عرب میں اس کی کوئی وجہ نہ ہو۔ دوسرا یہ کہ اگر فرض کر بھی لیا جائے کہ ایک ایسی ثابت متواتر قراءت جو کہ رسمِ عثمانی کے موافق ہے لیکن لغتِ عرب میں اس کی کوئی وجہ نہ مل رہی ہو تو یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ پوری لغتِ عرب میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے کیونکہ ہمارا علم محدود اور ناقص ہے۔

خلاصہ:

اس پوری بحث کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ قرآن اللہ کے رسول ﷺ پر ایک سے زائد قرآآت کے ساتھ نازل ہوا ہے اور اس کا مقصدِ وحید امت کے لیے آسانی اور تخفیف کا حصول ہے۔ دور نبوی ﷺ سے لے کر آج تک ہر زمانہ میں قرآآتِ متواترہ پر امت کا اجماع رہا ہے۔ ہر دور میں ائمہ قرآآت، اختلاف قرآآت کی حفاظت پر کمربستہ رہے اور کسی کو ان میں ردو بدل کرنے یا انہیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کا موقع ہاتھ نہیں آنے دیا اور ان قرآآت کی حفاظت کیلئے ایسے معیارات مقرر فرمائے جن کی بدولت یہ غیر کے اختلاط سے مامون ہو گئی ہیں۔ ہر دور میں قرآن کریم کی کسی قراءت کو قبول کرنے کیلئے تین شرائط کو لازم سمجھا گیا ہے: ایک یہ کہ مصاحفِ عثمانیہ کے رسم الخط میں اسکی گنجائش ہو، دوسرے یہ کہ وہ عربی زبان کے قواعد کے مطابق ہو اور تیسرے یہ کہ وہ آنحضرت ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہو۔ ان قرآآت کا اصل دارومدار روایات اور زبانی تعلیم و تلقین پر ہے اور وحی منزل من اللہ پر ہے جس میں رائے اور اجتہاد کو کوئی دخل نہیں، یہ سماعی اور منقولی ہیں اور ان سے مراد وحی قرآنی کے الفاظ کی ادائیگی میں سماعی اور منقولی اختلاف ہے اور جس علم میں ادائیگی الفاظ کے اس اختلاف کی کیفیات معلوم کی جاتی ہیں اس کو علم القراءت کہا جاتا ہے۔

حوالہ جات

[1] ابن فارس، ابو الحسین احمد بن فارس، مقاییس اللغۃ، مکتبہ مصطفےٰ البابی الحلبی، قاہرہ، 1972ء، ج5، ص 79,78

[2]ابو عبیدہ ، معمر بن المثنی ، مجاز القرآن ، موسسة الرسالہ ،بیروت، 1981ء، ج1، ص1

[3]ابن القیم الجوزی ، محمد بن ابی بکر الزرعی ، زاد المعاد فی ھدی خیر العباد ، موسسة الرسالہ ، بیروت ، 1991ء ،ج5 ، ص635

[4]راغب اصفہانی ، حسین بن محمد ، المفردات فی غریب القرآن ، دار القلم ، دمشق (س-ن)، ص532

[5]ابوحیان ، اثیر الدین محمد بن یوسف بن علی بن یوسف بن حیان ، تفسیر البحر المحیط ، مطبعة السعادۃ ، قاہرہ، 1328ھ، ج1 ، ص14

[6]الجریسی، محمد مکی نصر، نھایة القول المفید فی علم التجوید،مکتبة الصفا ، قاہرہ، 1999ء، ص23

[7]الزرکشی ،بدر الدین محمد بن بہادر بن عبداللہ الزرکشی ، البرہان فی علوم القرآن ، دار الحدیث ، قاہرہ ،2006ء،ص222

[8]ابن الجزری ، محمد بن محمد بن محمد ابن الجزری ، منجد المقرئین و مرشد الطالبین ، المکتبة الازہریة للتراث ، قاہرہ، 2008ء، ص8

[9]السیوطی ،جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی ،الاتقان فی علوم القرآن ، قدیمی کتب خانہ، کراچی (س-ن)، ج1،ص150

[10]القسطلانی،شہاب الدین القسطلانی،لطائف الاشارات لفنون القراآت،مرکز الدراسات القرآنیہ،المدینة المنورۃ،1434ھ،ج1،ص355

[11]طاش کبری زادہ، محمد بن مصطفی ، مفتاح السعادۃ و مصباح السیادۃ فی موضوعات العلوم ، حیدرآباد دکن، 1980ء، ج2 ، ص6

[12]الدمیاطی ، احمد بن محمد البناء ، اتحاف فضلاء البشر ، دار الندوۃ الجدیدۃ، بیروت ،1359ھ، ص5

[13]عبدالفتاح القاضی ، البدور الزاہرۃ ، دار السلام،قاہرہ، 2005ء، ص51

[14]الفضلی ، دکتور عبدالھادی الفضلی ، القراآت القرآنیہ ، دار القلم ، بیروت ،1985ء، ص54

[15]السیوطی ، جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی ، الاتقان فی علوم القرآن ، ج1 ،ص156155

[16]ابو الفتح الجنی ، عثمان بن جنی ، المحتسب ، دار سیزکین للنشر و التوزیع، استنبول ،1986ء، ج1، ص32

[17]مکی ، ابو محمد مکی بن ابی طالب القیسی ، الابانة عن معانی القراآت ، دار المامون للتراث ، دمشق ، (س-ن)، ص51

[18]ابن الجزری،محمد بن محمد بن محمد ابن الجزری،طیبة النشر فی القراآت العشر،مکتبہ دار الغوثانی، دمشق ،2012ء، رقم الاشعار 14-16

[19]ابن الجزری ، محمد بن محمد بن محمد ابن الجزری ، منجد المقرئین و مرشد الطالبین ، ص32

[20]ابن الجزری ، محمد بن محمد بن محمد ابن الجزری، النشر فی القراآت العشر ، ص18

[21]حوالہ بالا

[22]مکی ، ابو محمد مکی بن ابی طالب القیسی ، الابانة عن معانی القراآت ، ص5251

[23]جعبری ، ابراہیم بن عمر ، کنز المعانی فی شرح حرز المعانی ، مکتبہ اولاد الشیخ للتراث ، المملکة السعودیة ،2011ء،ج1 ، ص162

[24]الصفاقسی ، سید علی النوری الصفاقسی ، غیث النفع فی القراآت السبع ، دار الکتب العلمیہ ، بیروت،1999ء ، ص6

[25]ابو القاسم النویری ، محمد بن محمد النویری ، شرح طیبة النشر فی القراآت العشر ، دار الکتب العلمیة ، بیروت،2003ء ، ج1، ص119

[26]ایضاً،ج1، ص117

[27]السندی،الدکتور عبدالقیوم بن عبدالغفور السندی،صفحات فی علوم القراآت، المکتبة الامدادیہ، مکة المکرمہ،2010ء، ص54,53

[28]الزرقانی ، عبدالعظیم الزرقانی ، مناہل العرفان ، دار الکتب العلمیہ، بیروت ، 2004ء،ص232

[29]ابن الجزری ، محمد بن محمد بن محمد ابن الجزری، النشر فی القراآت العشر ، ص16